بجلی، بادل، لمبی بارش

بجلی بادل، لمبی بارش
لڑکی تھی، وہ رک جاتی تو اچھا ہوتا
بھیگ چکی، لیکن وہ پھر بھی
دُور دُور تک پانی میں ڈوبے رستے پر
بے پروا سی چلتی جاتی ——!!

ملائک ونجوم
آج سارے بے مُراد ہو گئے
شناختیں اُجڑ گئیں
سلگتے بام و در کے درمیاں
نثار ہو رہے ہیں، سوختہ بریدہ جسم
ریزہ ریزہ کچھ مکاں
وہ بے شناخت ہو گئی
وہ خواب تھی
وہ اک حسین نام تھی
وہ نام سے بچھڑ گئی

۱۹۸۷ء

شناخت

شناخت اس کے نام سے تھی
جسم کی بہار سے
شناخت آفتاب سے تھی
زلفِ آبشار سے
شناخت پیرہن سے تھی
غزالِ نور بار سے
شناخت اس کے شبنمی
فشارِ آتشیں سے تھی
زمیں دوز، آسماں صفت خمار سے

کھلی ہوئی تھی دور دور تک
تبسموں کی سُرخ دھوپ
تیز روشنی
تمام شفقتوں کی نرم چاندنی

ٹانگوں کی محراب سے بہتا،
سُرخ، سلگتا، جلتا لاوا
پاؤں میں کالے پتھر کی بھاری زنجیریں

پیشانی پر
کوئی بھی عنوان نہیں ہے
بجلی کے کھمبے والی، بس
خطرے کی تصویر بنی ہے

_____ ۱۹۸۷ء

ایک بے عنوان تصویر

برگد کا اک پیڑ پرانا
چتکبرے سانپوں کا سایہ
الجھی شاخوں کے گھیرے میں
خوں میں لت پت ایک آنچھ ہے
کٹا پھٹا سا ایک کان ہے
پیلے گھوڑے کے دو لب ہیں
گردن، سوکھی، سیخ سلائی
چٹیل، کھوکھل، بنجر سینہ
پیٹ کے ایک شگاف میں روشن
چوہے، کتے، چار مسافر

دیر تک تالیاں پیٹتے، شور کرتے رہے
نقدِ دادِ شجاعت لٹاتے رہے

ریپ کے سب مناظر کی تکرار میں
وہ توجہ کی خاموش تصویر تھے
نالۂ بے اماں
جب فضاؤں کو
فطرت کے حیران و ششدر مناظر کو
آنسو رُلاتا ہوا
بے مدد، خون آلودہ مجروح ہونٹوں سے رِسنے لگا
لذّتوں کے پریشان رسیا
سکوں کے لیے
گوشۂ موجِ مشروب میں آ گئے
یا وہ آسائشِ حاجت عام کو چل دیے

شہر کے کچھ علاقوں میں، معمول کے
سب فسادات، اس روز بھی
سارے اخبار لکھتے ہیں ——— جاری رہے

———— ۱۹۸۷ء

ایک فلم

یہ وہ تازہ ترین فلم تھی
جس کے چرچے تھے چاروں طرف شہر میں
اس کے کردار، سب
جانے پہچانے مقبول
ہیرو، بہادر، نڈر، حوصلہ ور
ترازو کے پلڑے میں
سیم و جواہر کا انبار
اس کی
حسیں اور جواں، شوخ، محبوب
قوسِ قزح، سرو قامت، شگفتہ
اداؤں کا گلشن
تماشے کی تکمیل میں
سب تہات میں
قتل و غارت میں، خوں ریزیوں میں
تماشائی
تیرہ یا پھر نیم تیرہ فضا میں
فہیا کار، سرشار ہیرو
سیہ کار دشمن کے جشن مکافات میں

تیرے زخموں پر مرہم رکھنے کے لیے
آج تم نے اس کا خالی پن
اُس کی اتھاہ، درماندگی
اپنے مضمحل جسم میں کیوں سمیٹ لی
میں جنموں کے سلسلوں سے
گذر گئی
شبِ گراں کی انتہا تک
سنور گئی

_____ ۱۹۷۸ء

آج میں نے رسمِ پیرہن کی زنجیر بھی توڑ دی
آج میں مادر زاد برہنہ ہو گئی
اجنبی سمندروں میں میرے جسم کے ٹکڑے
بے دست و پا بادبانوں کی طرح بہتے ہیں
آج میں مقدر کی دیواروں پر
آویزاں
تمام غلیظ چہروں کو
مجروح انگلیوں سے نوچتی ہوں
اور خاکِ رہ گزر میں
روندتے قدموں تلے بکھرتی ہوں . . .

رات کا آخری پہر قریب ہے
منظرِ آفتاب، میں نے برسوں پہلے
صرف خواب میں دیکھا ہے
میرے سگِ متروک
میرے ہمدم، میرے محافظ
میرے حصے کا لمحۂ سرشار
شاید، میری ہر دھڑکن سے، ہر سانس سے
چمٹ جاتا ہے
لیکن تو ——— موجِ بے اماں کا ہم سفر
میری خون آلودہ دھجیوں کے احترام میں
دفعتاً طلوع ہوتا ہے

تیرے جراثیمی لمس کے اعجاز سے
آج تھکی ہاری ماں کی آنکھ لگ گئی
لوری تو مجھے سنانی تھی
تیری نیند ری کو بلانے کے لیے

میری قوسوں اور زاویوں پر
دودھ سے چھلکتی بھرپور چھاتیوں پر
تھوک، لعاب، بدبودار شراب
زہرآمیز بنجر قطرہ تولید
بدکار سانسوں اور منحنی سسکیوں
کی متعفن، مسلسل
بارش ہوتی ہے
مَیں جو نے سموم میں بہتی ہوئی
برگ و گل کے نرم و نازک، دل آویز
خواب دیکھتی ہوں
کابوس
کارواں، در کارواں
امنڈتے ہوئے
میرے لہو میں اتر جاتے ہیں
ماں، میری خالق تو کہاں ہے؟
ماں، میری خالق تو کہاں ہے؟

میری کوکھ میں
ایک نو دمیدہ پھول تھا
جو خنجروں کی یلغار میں
خاموش تو ہو گیا
لیکن خیالِ موسمِ گل سے
جب سر سبز ہو جاتا ہے
تو سورج کے برابر ایک انگارہ
میرے وجود کی گہرائیوں میں
سلگ اٹھتا ہے

سوگندھی

میرے مقدر کی بدرنگ دیواروں پر
ان گنت
مکروہ چہرے
آویزاں ہیں
سر پر چھت ہے یا دریدہ آسمان؟
روزنوں سے

آج صدیوں بعد برہنہ ملی ہو
تم نے گداگروں کے انبوہِ گراں میں
اپنے تمام آفتاب و مہتاب تقسیم کر دیے
خاموش و پریشاں اب
مجروح ناخنوں سے
آسمانوں کو کریدتی ہو
لیکن اتفاقاً، ٹوٹتا ہوا ہر ذرۂ نور
خلاؤں کی نذر ہو جاتا ہے

میری ننھی منی دوست
لمحۂ موجود میں بھی
تمہارا البیلا نارنجی ربن
دل آویز غنچۂ تبسم
رنگوں کا گلستاں
عمرِ رواں کے نامحرم موسموں میں
میرے وجود کی گہرائیوں میں
سرسبز ہے
اور افق کی تہی دامن سرحدِ تاریک
تمہارے ننھے منے رقصاں قدموں کی
روزِ آخر تک
منتظر ہے

———— ۱۹۷۸ء

ننھی مُنّی گُڑیا پری

ایک ننھی مُنّی گڑیا پری
روز و شب
ستارے تقسیم کرتی تھی
اس کے اُلجھے ہوئے بالوں میں
البیلا نارنجی رِبن تھا
آنکھوں میں آفتاب
ہونٹوں پہ غنچۂ تبسم
پیرہن کھِلکھِلاتے رنگوں کا گلستاں
اور ننھے ننھے دو سپید پاؤں
جو روشنی کا سفر
اُفق تک
جاری رکھنے کے لیے
ہر لمحہ بے قرار و سرشار تھے

میں روز و شب
تم دونوں کے
خواب دیکھتا ہوں

ہم سب
موسموں کی یلغاریں
گرتے جاتے ہیں
بکھرتے جاتے ہیں

اگلے برس کا موسم
گزرے ہوئے برس کے موسم کی نسبت
لوگ کہتے ہیں
شاید سنگین تر ہوگا

۱۹۷۸ء

اگلے برس کا موسم

میری اور تمھاری آخری ملاقات
موسمِ بہار کے اُن دنوں میں ہوئی
جب راتیں تو قدرے خنک ہوتی ہیں
لیکن دنوں کے چہروں پر
رفتہ رفتہ
کدورتیں جنم لینے لگتی ہیں

میرے گھر کے قریب
ایک سایہ دار پیڑ ہے
جو تمھاری طرح میرا کوئی نہیں ہے
تم دور کے جزیروں میں آباد ہو
اور پاؤں پاؤں چل کر
پیڑ میرے گھر نہیں آیا

سفرِ زوال میں
صرف میری دریدہ آنکھیں باہر رہ جاتی ہیں
تمہارا پیکر
لمحہ بھر کے لیے میری پتلیوں میں طلوع ہوتا ہے
اور پھر اجنبی دنیاؤں کی سیاحت کے لیے
آفاق کا ہم سفر بن جاتا ہے

میری باقی ماندہ آنکھیں
میری آخری دنیا کے بوجھ سے
دلدل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں

______ ۱۹۷۷ء

آنکھیں

تمھاری اُداس آواز کا سایہ
سرِ شام بوسیدہ منڈیروں سے
آنگن میں اُترتا ہے
رینگتا ہوا بام و در کے لہو میں پھیل جاتا ہے
میں چند ننھے منے دیے روشن کرتا ہوں
وہ یورش شب سے قبل ہی گل ہو جاتے ہیں
خواب دیکھنے کی اب مجھے عادت نہیں رہی
اور جو بہت دن پہلے شکستہ ہو گئے
ان کی تیز نوکیلی کرچیاں
میرے رگ و پے میں سرسراتی ہیں
میں تنہائی اور وابستگی کی دلدل سے
اپنوں اور اجنبیوں کو
دیوانہ وار آواز دیتا ہوں

اپنی پُراسرار پرواز کے سفر میں
اگر تم اتفاقاً کبھی
اس طرف سے گزرو
تو اپنا ایک نازک رکشن پر
میرے لیے
موجِ آبِ تیرہ کی نذر کر جانا
مَیں زیرِ آب ہوتے ہوئے بھی
اس سے لپٹ جاؤں گا

۱۹۷۷ء

تم نے مجھے منتظرِ سیلِ موجِ تیرہ سے محفوظ رکھنے کے لیے دعا کی
اور الوداع کہتے ہوئے
کھوئی کھوئی آنکھوں سے، شام کے
نیم وا دریچے سے باہر کا
دھندلکے میں تحلیل ہوتا ہوا
منظر دیکھنے لگیں

خواہش نوا پرندے تو ساعتِ طلوع میں
روشنی اور نغمگی کے پیام لاتے ہیں
اور دل و جاں کو
آفاق تک منور کر دیتے ہیں
تم کیوں صبح کی پہلی اجلی کرن کے ساتھ
اجنبی وادیوں کی جانب
روانہ ہو گئیں

مَیں تمھارے الوداعی ارشاد کی تعمیل نہیں کر سکا
سعیٔ شب و روز کے باوجود تمھیں
دل و جاں سے نوچ کر الگ نہیں کر سکا
دریدہ بادبانوں کے ہمراہ بہتا ہوا
اجنبی سمندروں میں
تمھیں پکارتا، تمھیں تلاش کرتا رہا
لیکن شاید مجھے غرقِ آب ہونا تھا
ایک افسردہ شبِ گراں کا ہم سفر
مَیں آخر کار
[illegible]
اپنے زیرِ آب مقدر سے جا ملا

وقتِ رُخصت

وقتِ رُخصت
تم نے مجھے کہا تھا
کوئی شخص اس قدر
اہم اور ناگزیر نہیں ہوتا ـــ
کہ اپنے ذہن و دل سے
فراموش نہ کیا جا سکے

ایک نکتے سے دوسرے تک
سبک انداز پرندے کی طرح
پرواز کرتے ہوئے

مجھ پر دفعتاً یہ انکشاف ہوا
تم میری دعا کے
مختصر وقفے میں، اپنے
پُرامکان
تعطیل کے سفر پر
روانہ ہو چکی تھیں

۱۹۷۷ء

مَیں کسی قریۂ پُراسرار میں چلی جاؤں
اور روز و شب کے
یخ بستہ سلاسل سے آزاد ہونے کے بعد
دھوپ، ہوا، چاندنی
اور موسم کی پہلی بارش کو
اپنے رگ و پے میں
موجِ خوں میں
رواں کرلوں
جذب کرلوں

اس رات مَیں نے بارگاہِ خدا میں
عجز و انکسار سے
ایک نئی، انوکھی، عجیب و غریب دعا کی
مَیں وہ قریۂ حیراں بن جاؤں
جو دامنِ کوہ میں
رنگوں، روشنیوں، خوشبوؤں کے ہمراہ
تمہارے خرامِ تازہ کے
خیر مقدم کے لیے منتظر ہو

صبح دم میری دعا قبول ہوگئی
مَیں ایک خاموش
پرسکون، اجنبی وادی کے گوشے میں
تمہارے قدموں کی
اوّلیں، نرم رو
سرگوشیوں کا منتظر تھا

لیکن طلوعِ لمحۂ اعجاز میں

دُعا کے بعد

تم روز و شب کے
مانوس منجمد تسلسل سے
اوب گئیں اور سیرگی کی سرحدوں میں قدم رکھتے ہوئے
ایک سرسبز، خوش گوار
تعطیل کا خواب دیکھنے لگیں

اس حسین خواب کا ذکر کرتے ہوئے
تم نے اداس نم آلودہ آواز میں
مجھ سے کہا تھا :
مَیں چاہتی ہوں

"میں علیل تھی، تنہا تھی
تم مجھے دیکھنے نہیں آئے، میرے پاس نہیں بیٹھے"
شرمندہ و نادم
میں نے اپنا برگِ زرد
سپردِ خاک کر دیا
اور اپنے نطقِ ناتواں کا
وہ حصّہ تراش کر پھینک دیا
جو آشنائے حرفِ شکوہ تھا

میں تمھارا کون تھا
اپنی خامشی میں
سر سے پاؤں تک سرشار ہو گیا
تمھارے حرفِ شکوہ کے اعجاز سے
لمحہ بھر کے لیے
جلتے ہوئے جنگلوں کے درمیاں
برگِ سبز کی طرح آباد ہو گیا

۱۹۷۷ء

حرفِ شکوہ

میری بے سر پیر کی، بیکار
باتوں کے ہجوم میں
صرف ایک ہی حرفِ شکوہ تھا
جسے مَیں نے
تمھارے حسن کی نذر کر دیا
اور تم نے لہراتے ہوئے آنچل کی ہوا سے
اسے اس انداز سے اڑا دیا جیسے وہ
نیم جاں، برگِ زرد تھا
جو راہ گم کردہ
موسمِ گل کے آنگن میں اتر آیا

آج تمھارے لبِ نازک پر بھی
ایک حرفِ شکوہ طلوع ہوا

میرے سینے کے زنداں میں
تمھاری آرزو کے احترام میں محفوظ
اس خنک حرفِ نرم رَو پہ جانے کیا گزری ؟
ہر لمحہ
ایک سفاک شعلے کی طرح
اس کی آتشیں حدود پھیلتی جا رہی ہیں
روز و شب یہ میرے دل کی
دیواریں چاٹتا ہے
کریدتا ہے
اور سوختہ روزنوں سے
مجھے تاریک سمندروں کی
منتظر صدائیں سنائی دیتی ہیں
دکھائی دیتی ہیں

————۱۹۷۷ء

تاریک سمندروں کی صدائیں

مَیں نے اپنے
تمام نرم و نازک حسین الفاظ
تمہاری نذر کر دیے
مَیں کس قدر خوش بخت تھا
لمحۂ ملاقات میں
تم نے مسکراتے ہوئے سب قبول کر لیے
صرف ایک حرفِ نرم رو
تم نے معذرت کے ساتھ مجھے لوٹا دیا
جسے تم اگر قبول کر لیتیں تو تمہارے برگِ دل پر
قطرۂ شبنم کی طرح آویزاں ہو جاتا
یہ لفظ مجھے واپس دیتے ہوئے تم نے مجھ سے کہا تھا
اسے اپنے نہاں خانۂ دل میں محفوظ رکھنا
مَیں اس کے شفیق لمسِ امکاں سے ماورا جا چکی ہوں

کے پار چلی جاتی ہو
اور میں
ان سنگین فاصلوں کو عبور کرنے کی کوشش میں
ہر لمحہ
اپنے دریدہ جسم
سلگتے ہوئے ذہن و دل
کا کوئی حصّہ کاٹ کر، نوچ کر پھینک دیتا ہوں

میں تمھارا کوئی نہیں۔

۱۹۷۷ء

بے سر پیر کی، اوٹ پٹانگ
لیکن دل آویز باتیں کرتی رہو

مَیں نے جب تمھیں قریب سے دیکھا
تو مجھے یکایک محسوس ہوا
مَیں تمھیں صدیوں سے جانتا ہوں
اور اس پرانی داستاں کے آغاز میں
تم نے
تمام رسمی رشتوں، وابستگیوں سے آزاد
خدا کی طرح
مجھے ہزاروں، لاکھوں
نعمتوں اور مسرتوں سے مالا مال کر دیا تھا
اور پھر تم
کائنات کی وسعتوں کے طویل سفر میں
نہ جانے کہاں گم ہو گئیں

مَیں تمھاری طرف جب بھی دیکھتا ہوں
میرا دل کہتا ہے
مجھے تمھارا صدیوں پرانا قرض چکانا ہے
ان مظالم کا
کفّارہ ادا کرنے کے لیے
اپنے منظوم شب و روز سے ماورا جانا ہے
جو تمھیں، تمھارے چہرے کو مسخ کرنے کے لیے
تم پر توڑے گئے
لیکن تم ایک روشن دائرے کی طرح قریب ہوتے ہوئے بھی
اکیلا اکیلی
صدیوں پر پھیلے ہوئے فاصلوں

تم نے ایک روز

تم نے ایک روز مجھے بتایا تھا
کہ جب تم ننھی منی گڑیا سی معصوم بچی تھیں
تو ماں تمھیں ایک منفرد حسین نام سے پکارا کرتی تھیں
میں تمھارا کوئی نہیں
لیکن کئی بار میرا جی چاہا ہے
تمھیں اسی خوبصورت نام سے پکاروں
تمھارا چہرہ دمک اُٹھے
اور تم مجھ سے بلا تکلف دُنیا بھر کی

دن بھر کی دشت نوردی کے دوران وہ
میرے ہم راہ چلتا ہوا
سر سبز نخلستان ہے
ایک ہے
اپنے آپ میں مکمل ہے

آج سرِ رہ گزر ہجوم میں
اجنبی موجِ خوں، برہنہ آب و گِل
بدگمان موسموں کی پالی ہوئی
سانولی، سیدھے سادے نقوش
بڑی بڑی حیران آنکھوں والی
ایک معصوم صورت اداس لڑکی
میرے سامنے طلوع ہوئی
اور جب وہ دیکھتے دیکھتے
سیلِ ہاؤ ہو میں غروب ہو گئی
تو مجھے دفعتاً یاد آیا
بے کراں فاصلوں کے سلاسل کی اسیر
وہ میری دوسری بیٹی تھی !!

ــــــــ ۱۹۷۶ء

دُوسری بیٹی

گول مٹول چہرے والی
یہ لڑکی
میری سولہ سالہ بیٹی
جب سے پاؤں چلنے لگی
میرے شام وسحر کی ہم سفر بن گئی

صبح دم مسکراتی ہوئی
مجھے دروازے تک چھوڑنے جاتی ہے
شام کو میرے گھر لوٹنے پر
روشن شفّاف آنکھوں سے
دروازے پر میرا خیر مقدم کرتی ہے
میرا ہاتھ تھام کر
مجھے میری پناہ گاہ تک لے جاتی ہے

کہ شانہ دار شفاف موسم
روشن چہروں والے عزیز دوست
گزری ہوئی خمار آلودہ شام
ان سب کا بے کراں، بے پناہ حسن
میرے مقدور سے کہیں زیادہ تھا

۱۹۷۶ء

اس حسین شام کو

اس حسین شام کو
مَیں تنہا نہیں تھا
میرے ساتھ میرے عزیز روشن چہروں والے
دوست تھے
اور شاندار شفاف موسم

مَیں اس قدر خوش تھا
کہ لمحۂ پرواز میں
ماضی، حال اور مستقبل سے ماورا چلا گیا
اور ایک اجنبی رہ گزر پر
کسی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا

اس اتّفاق کے بعد، نہ جانے کیوں
مجھے بار بار محسوس ہوا

برسوں بعد ایک ملاقات

مَیں برسوں بعد
اس سے کل ملا
وہ میرے جانب، چند لمحے
ٹکٹکی باندھے ہوئے تکتی رہی
حیران سی، تاریک سی

پھر دفعتاً
وہ موجِ بے پایاں، برہنہ روشنی تھی

تار چاندی کے
اتر آئے تو ہوں گے
اس کے بالوں میں
کئی برسوں سے
کیسی جھپاتی دھوپ تھی، لڑکی تھی وہ
میں عمر کے احساس میں کھویا رہا
اک جست میں
وہ سبز پیڑوں
آسمانوں، وادیوں میں لوٹ آئی

کچھ اور نظمیں

کوئی ملبہ، کھنڈر
گر انھیں مل گیا بھی
تو رہ دیکھنے والا
ان کی وہاں
کون ہوگا؟
وہ بے نام چھوٹا سا رستہ
جو گھر تک پہنچتا تھا
ممکن ہے اس وقت تک
اس کا کوئی نشاں بھی نہ باقی رہے

۱۹۸۷ء

اک زمانہ ہوا
جا چکے ہیں
کہاں ان کو سونا ملے گا ؟
ملے گا بھی یا شاید نہیں
کوئی بھی کچھ نہیں جانتا
اک اندھیرا، گھٹا ٹوپ، گہرا اندھیرا ہے
چاروں طرف
لوگ، بے سمت، سرپٹ
اُڑتے چلے جا رہے ہیں

وہ گھر
اور نگر، چھوڑ آئے تھے
جن کو یہ پیچھے
سنا ہے
کہ سب جل رہے ہیں
سبھی
راکھ ہوتے چلے جا رہے ہیں
یہ سونے کی خاطر
بھٹکتے مسافر
سلامت
اگر اتفاقاً کبھی
چند ذرّے کہیں چیتھڑوں میں
چھپائے ہوئے
گھر کی جانب پلٹ آئے
جائیں گے آخر کہاں جائیں گے
واپسی پر
دھوئیں میں گھرا
ان کا اپنا، پرانا سا گھر

گولڈ رش

اجنبی راستوں پر
امڈتے ہوئے
لوگ،
اک دوسرے کو
ہر اک گام پر
کاٹتے، روندتے
آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں
یہ وہ
لوگ ہیں،
کھوج میں جا رہے ہیں جو
سونے کی
سارے کے سارے بڑی دھوم سے
ان کے ماں، باپ بھائی بہن
ان کے اپنے
کسی دوسری اجنبی رہ گزر پر
اسی کھوج میں

کیا عجب رسم غارت گری تھی
کھنڈر ہی کھنڈر
آنکھ کے سامنے، دور تک
بستیوں کی جگہ رہ گئے

یہ بڑی ہی مبارک ہے —— یہ ساعتِ نو
کہ انجام کے قرب میں
داستاں گو نے امروز
وہ بال و پر
اک نئے، داستانی حسیں طائرِ نور کو
دستِ اعجاز سے
یوں عطا کر دیے ہیں
کہ وہ کھیل پرواز میں
آسمانوں کو، تیرہ فضاؤں کو
اجڑے ہوئے
شہر و قریہ کو
واماندہ، افسردہ چہروں کو روشن، منور، شگفتہ و تابندہ کرتا رہے
داستاں کا سفر
کل بھی جاری رہے

—— ١٩٨٦ء

داستان گو

اک زمانے سے اس کا یہ معمول تھا
اس کی ہر داستاں
اک المناک انجام پر ختم ہوتی رہی
موسموں، حادثوں، خرخشوں کی
فنا کار یلغار
بستے گھروں، بولتی شور کرتی ہوئی
رہ گزاروں پہ جاری رہی
بعض اوقات

میں اجنبی بھیڑ میں تم سے بچھڑا
تمہیں کوئی سفاک، جلتی ہوئی لہر

ہمراہ اپنے
بہا کر کہیں لے گئی
سارے پیکر، ستارے، شگوفے
مہ و سال کے زیر و بم میں
ہواؤں کی زد میں مسلسل بکھرتے رہے

غیر کے پھول کو شبنم کے قطرے کی طرح
اپنے ویراں سینے میں
اس لڑکی نے جذب کیا
اور منظر منظر جلتی آگ میں کود گئی
دریا کے اس پار گئی

کس بستی میں؟
کون سے سونے، اجڑے گھر میں
اب وہ لڑکی رہتی ہے
کون بتائے
دور دور تک
آوازوں کا جنگل ہے

________ ۱۹۸۶ء

آوازوں کا جنگل

جب وہ اپنے گھر سے نکلی
اس کے پیچھے چلنے والی
سب آوازیں
دشمن تھیں
اس کے آگے چلنے والی
سب آوازیں چیخیں تھیں

آوازوں کے وسط میں
جلتے آسمان کے سائے تلے
شعلوں کے طوفان نے
اک ننھے منّے کو جنم دیا

اس کی ماں
اس کا باپ
اس کے گھر کے سارے لوگ
سب جلتی آوازیں تھیں

نجوم اب تمام
میری دسترس میں ہیں
میں ان کی روشنی کے پھول
کائنات کے قریب و دور میں بکھیر دوں
میں خاکِ نو کی
خواب ناک وادیوں میں
زیرِ لب دعا کروں
حسین گیت، قہقہہ، نئی صدا
کوئی نوائے بیکراں سنوں
میں شعلۂ ضیا کے وسط میں رہوں
میں کشتِ نو کا اذن دوں
یا سب کا قتل اپنے ہاتھ سے کروں

کہیں یہ کوئی واقعہ
کہیں یہ کوئی حادثہ
کہیں یہ کوئی ناوکِ گماں
کسی کھنچی کماں میں ہے
میں سانس گن رہا ہوں آج خاکِ زار پر
طلوع کے لیے مگر کہیں یہ مضطرب
فسوں طراز اجنبی سا سلسلہ، کوئی
نہاں مرے زیاں میں ہے۔

_____ ۱۹۸۶ء

سلسلہ

شمار ہو چکے نجوم
ان کا ایک دوسرے سے فاصلہ بھی ہو چکا رقم
ان کے سب نقوش
ان کے سب نشیب اور فراز
زائچوں میں ڈھل چکے
کون کس کے کتنا پاس ہے
کون کس سے کتنا دور ہو گیا
کشش وہ کون سی تھی
جو کسی کو مرگِ ناگہاں کے آبشار میں
اتارتی چلی گئی
وہ موجِ اضطراب کون تھی
جو قلزمِ سکوں میں جذب ہو گئی
کہاں کہاں مرے قدم گئے ؟
کہاں کہاں مرے قدم بڑھیں گے کل ؟
جو راز کل تلک تھے راز
مشتہر ہوئے تو عام ہو گئے

حادثہ ایسا ہوا
مَیں نے دیکھا، مجھ پہ وہ اپنی نظر رکھتا ہوا
ٹیڑھی اُلٹی چال سے چلنے لگا
رہ گزر مصروف تھی
دفعتاً وہ گھومتے پہیّوں کی زد میں آگیا، کچلا گیا

مَیں سڑک پر چل رہا ہوں
ایک پتّہ، ایک پرزہ، ایک خواب
ہے ابھی باقی سفر شاید مرا
میرے پیچھے اجنبی سی چاپ ہے
رفتہ رفتہ میری جانب جانے کیوں بڑھتی چلی آتی ہے آج
پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں بار بار

۱۹۸۶ء

وہ مرے آگے تھا، میں
اس کے پیچھے چل رہا تھا
اور دونوں اجنبی
میرا اپنا شہر تھا
غالباً اس کا بھی تھا
دیکھتا تھا مجھ کو مڑ مڑ کر وہ شاید اس کو خدشہ تھا
کوئی دشمن ہوں میں
اس کا پیچھا کر رہا ہوں
اور اس کو قتل کر ڈالوں گا میں
دونوں اپنی اپنی منزل کے اسیر
وہ کسی تاریک اندھے غار کی جانبِ رواں
میں کسی برسوں پرانی یاد میں کھویا ہوا

وہ شخص اپنے دست وپا
بریدہ، خود بریدہ دست وپا
تلاش کر رہا ہے شہر کی ہر ایک رہ گزار پر
تمام لوگ سمت سے بچھڑ گئے
تمام لوگ لٹ گئے
تمام لوگ،
تماشۂ زیاں کی نذر ہو گئے
شور ہے
برس رہی ہے
سب کے سر پہ راکھ سی
تمام لوگ محض سنسنی
تمام لوگ ملتوی ——!!

——— ۱۹۸۷ء

تمام لوگ ملتوی ــــــ!

وہ سوچتا تھا، راستہ فرار کا
کوئی تو ہوگا جس سے کر سکے گا وہ
تمام ایسے کام ملتوی
جو اس کو ناپسند تھے

عجیب اتفاق تھا
وہ کام جو ناپسند تھے اسے
یا وہ جنھیں
امید تھی اسے
کرے گا ایک روز وہ پسند
سب بگڑ گئے
فضا میں روز و شب بکھرتی
خاک ذائقہ سی بے دلی
منافقانہ برہمی کی زد میں آ گئے
یہ انتخاب
اس کی دسترس سے ماورا چلا گیا
وہ کیا کرے گا آج، اور کیا کرے گا ملتوی

معمول

ذوقِ اخبار بینی کے آغاز میں
نرخ نامہ اسے خوب مرغوب تھا
کچھ دنوں بعد وہ
ریپ، ڈاکہ زنی، اور چوری سے مانوس ہوتا گیا
ذوق پروان چڑھتا گیا
قتل، بلوہ، فساد اور دہشت، وہ سب منزلوں سے گزرتا گیا
صبح دم تازہ اخبار سے
مرنے والوں کے اعداد چنتا تھا وہ
ناشتہ ایک معمول تھا
مرنے والوں کا میزان بھی ایک معمول تھا

پورا اخبار، کیا حادثہ ہے، کہ امروز مرنے کی خبروں سے خالی رہا
زیرِ صدمہ ہے وہ
سوچ میں گم ہے کیا ہو گیا
خون آلودہ کوئی خبر
ریڈیو نے بھی شاید سنائی نہیں
کل کے لاشوں بھرے تازہ اخبار کا
وہ ابھی سے ہوا منتظر
وہ ابھی سے ہوا منتظر!!

۱۹۸۶ء

میں اس کی باتیں سنتا ہوں
اب روشنیاں
جلتے شہروں، جلتے لوگوں کی روشنیاں
ہم سب کی جانب پاؤں بڑھاتی آتی ہیں
لڑکی کہتی ہے :
مت سوچو، تم پاگل ہو، میں دیوانی

کل کھیتوں میں
جب جلتی آگ کے پھول کھلیں
میں پھولوں میں سو جاؤں گی
تم آگ پہن کر آسمان کو پی لینا

سنہ ۱۹۸۶ء

شہر میں اک شخص تھا
کر تو سکتا تھا عطا
وہ معنی و مطلب نقوشِ غیر کو
لیکن عجب یہ حادثہ ہے
وہ بھی لب بستہ و نابینا سنا ہے ہوگیا

اک زمانہ ہوگیا
شہر میں اک شخص تھا ——

—— ۱۹۸۶ء

شہر میں اک شخص تھا

لوگ کہتے ہیں مرے چہرے پہ کوئی
اجنبی تحریر ہے
آئینے کے رو بہ رو ہوتا تو پڑھ لیتا
مَیں حرفِ راز کو
منزلِ تفہیم کا مجھ کو یقیں لیکن نہیں
اور پھر
اتفاق ایسا ہے اک مدّت سے مَیں
سب آئینوں کے فیض سے آزاد ہوں
کوچہ و بازار میں
ماورائے لفظ و معنی
لوگ محوِ کارِ جاں
موجِ ہجومِ بے اماں

دیدۂ حیرت، سیہ دیوار میں بھی بن گیا
ایستادہ تھے مقابل، دونوں، ہم دونوں
تیرگی بڑھتی گئی
اک سیہ دیوار
شب بھر
دوسری، مبہم سیہ دیوار کو پڑھتی رہی

۱۹۸۶ء

سیاہ دیوار

قریۂ ویراں کا نامحرم سا موسم
شام تھی، اک نامہ بر
میرے نام
گرد آلودہ، فسردہ نامۂ خاکی
خدا جانے کہاں سے لے کے آیا
حرف و معنی، روز و شب کی برہمی
تحریر کا افسوں، وبالِ داستاں، کارِ زیاں
اسرار کا اک سلسلہ

اک سیہ دیوار کی مانند تھے مکتوب کے الفاظ
اوراں کا پریشاں، اجنبی، تاریک نامہ بر

سب کے سب
اپنی پنہ گاہوں کی جانب
عازمِ منزل ہوئے
سب کے سب رخصت ہوئے

گدھ، چیلیں، ان گنت بے رحم مردہ خور طائر
دور تک مصروفِ کار
سر بریدہ روزنوں میں
لوگ کہتے ہیں، گماں ہے
کوئی سایہ تیرتا ہے
اجنبی سی نھنی، منی سی کوئی آواز ہے
گونجتی ہے پتھروں کے آر پار

۱۹۸۶ء

اَجنبی آواز

سب فصیلیں منہدم ہوتی گئیں
رہ گزر پر سنگ چہرہ لوگ تھے
کارواں در کارواں بڑھتے گئے
خانۂ محفوظ کے
خاموش، لب بستہ مکیں

رفتہ رفتہ
ہیزمِ انبوہ
اس انداز سے بنتے گئے
ان کا یہ انجام جیسے روزِ اوّل سے
درِ امکاں میں تھا
ان کے جسم و جاں کی تحریرِ زیاں
کچھ طلسماتی، فسوں انداز تھی ایسی
فلک بیں، نکتہ رس
قاری، تماشائی
غبارِ گمرہی کو عام کر کے
ماورائے چشم و گوش
سب کے سب، اٹھتے گئے، چلتے گئے

آدابِ مروّت میں تو مصروف رہے ہم
تجدیدِ ملاقات کی صورت نہ ہوئی کوئی بھی لیکن
ہم دونوں ہی شاید
پابستہ تھے، مجبور تھے، مصلوبِ زیاں تھے
جسم و دل و جاں کے
سب گوشوں میں تابوت تھے، آسیب، پُراسرار صدائیں
ہم نوحۂ زنجیر سے مانوس تھے، پر کرنے کو کیا باقی تھا، کچھ بھی تو نہیں تھا
کچھ بھی تو نہیں تھا۔

______ ۱۹۸۶ء

پابستہ

اس نے بھی کئی بار مجھے یاد دلایا
مَیں نے بھی کئی بار یہ سوچا
حالات بڑے غیر ہیں، پھر بھی
تجدیدِ ملاقات کریں، برسوں کی بے نام تفاوت کا ازالہ کریں، کچھ تو کریں ہم
کچھ دیر کہیں بیٹھیں، غمِ دل کی کہیں اور سُنائیں
گذری ہے جو ہم دونوں پہ دورانِ مسافت
ممکن ہے وہ، دلچسپ بھی ہو، تلخ بھی ہو، وجۂ ندامت بھی ہو، مجبوریٔ اوقات ہو یا
محض فسانہ

ہم دونوں حکایات کے زخموں سے وہ پُر کرلیں خلا بھی
جو ہم نے بہت دیر ہوئی سینہ و دل میں
دانستہ اُتارا
چہرے تو کئی رخشاں سرِ بام تھے برسوں
ہم لوگوں نے لیکن
محرومیٔ قربت کو، تمازت کو، شعار اپنا بنایا
اس نے بھی کئی بار مجھے یاد دلایا
مَیں نے بھی کئی بار اسے یاد دلایا

چھت پر اور آنگن میں سونے والے
سب بے نام تھے
موسم ایسا آیا
چھت پر سونے والا شہزادہ تھا
آنگن میں پریوں کی اک شہزادی سویا کرتی تھی
شہزادے کا قتل ہوا تھا
شہزادی کہرام میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھی تھی

چھت میں
اور آکاش میں اب
لاکھوں روزن ہیں

بے موسم
ہم پر انگاروں کی بارش اکثر ہوتی ہے
پہروں جاری رہتی ہے

ہم زندہ ہیں شاید
ہم سب باتیں
خالی باتیں، باتیں، باتیں کرتے رہتے ہیں

۱۹۸۶ء

باتیں، خالی باتیں

ہم برساتوں کے آنے تک
پچھلے برسوں میں
چھت پر سویا کرتے تھے
یا آنگن میں
آسمان کی، تاروں کی
یا ان لوگوں کی باتیں کرتے کرتے
خوابوں میں کھو جاتے تھے
جو چلتے چلتے جب تھک جاتے
خاموشی سے
دن اور رات کی سرحد پر
آنکھیں موند کے سو جاتے تھے

میرے کوچے میں

برس گزر گئے
نہ جانے آج کیسے یاد آگیا
تمھیں وہ نام جو مرا نہیں تھا
اور مجھ کو بھی وہ نام
جو ترا نہیں تھا
خاک پھانکتی خموشیوں میں ایک بار پھر
وہ حادثہ ہوا
میں تمھارے جسم و جاں میں دُور تک نکل گیا
ادھر تم ——— نگاہ و دل کی وسعتوں میں
ایک بار پھر
تنارِ حشر تک سما گئیں
برہنہ جسم آگنوں کے خون میں اتر گئے
گزر گئے . . . برس گزر گئے

۱۹۸٦ء

گُذر گئے، برس گُذر گئے

زوالِ آشنا
اُداس موسموں میں
ہم برہنہ جسم
آئنوں کے روبرو
عجیب اتّفاق تھا
فعال تھے
مگر نہ سرخ رو، نہ بے وفا، نہ شرمسار ہو سکے
ہوائیں چیختی رہیں
سیاہیوں میں
برف باریوں میں
شعلہ باریوں میں
رات بھر زمین دوز
سب قیامتیں، رواں رہیں
رواں رہیں

حادثہ، سانحہ، واقعہ
خاک و خوں کا کوئی سلسلہ
اس کے پیہم تعاقب میں ہے

لوگ سرگوشیوں میں
سُنا ہے
دعا مانگتے ہیں، سزا مانگتے ہیں، جزا مانگتے ہیں
عجب لوگ ہیں
لوگ
سرگوشیوں میں
خدا جانے کیا مانگتے ہیں

______ ۱۹۸۵ء

تعاقب

وہ کہسار رودِ دریا سے
صحرا سے
جلتے ہوئے آنگنوں سے گھروں سے
ہجومِ فراواں سے کچلی ہوئی رہ گزاروں
صداؤں کے چیخوں کے کہرام سے
روز و شب
یوں گزرتا ہے
جیسے یہ معمول
روزِ ازل
اس کے چہرے کی وحشت پہ لکھا گیا
موجِ صرصر کی مانند
اس کے لہو میں اتارا گیا

وہ منزل سے ناآشنا ایک بے نام
لمبے سفر میں ہے شاید
کوئی سایۂ غیب
اس کے مراتب میں ہے

ننھے کی شفاف ، روشن، درخشندہ آنکھوں میں
تنویر، تصویر
لاکھوں
حسیں چاند، سورج ، ستارے
شگوفے ، پرندے
پرندے ، شگوفے
حسیں چاند، سورج ،ستارے

سنہ ۱۹۸۵ء

جونہی شام ہوتی ہے
موسم کی یورش میں
وہ ملگجی شال اوڑھے ہوئے
اپنے بستر میں
شفقت، تمازت بھرا
اک گھروندا بناتی ہے
ننھا گھروندے کی جانب لپکتا ہے
دونوں بڑی دیر تک
عمر کے فاصلوں سے گریزاں
کتابِ مصوّر پہ جھکتے ہیں
اوراق پر
قہقہوں، زیرِلب زاویوں
نرم سرگوشیوں کی زباں سے
پُراسرار باتوں، فسانوں کے
منظر جگاتے ہیں
شہرِ فسوں کے صدا کار خوابوں کے
ایواں سجاتے ہیں

ڈھلتی ہوئی شام
ڈھلتی ہوئی شام
چشمے کی چلمن
شفیق اور سیال واماندہ آنکھیں
شفیق اور سیال واماندہ آنکھیں

ڈھلتی ہوئی شام
ننھے کی، شفاف، روشن، درخشندہ آنکھیں
ڈھلتی ہوئی شام

شگوفے، پرندے، شگوفے

شفیق اور سیال
واماندہ آنکھوں پہ نازک سے چشمے کا سایہ
لکیروں میں آویزاں
چہرے پہ گزرے ہوئے روز و شب
اور بالوں میں چاندی

اڑائے لیے جا رہے تھے
مرا کوئی ہم زاد تھا
مجھ سے بچھڑا ہوا
دُور کی وادیوں میں کہیں
اس کو جنموں کی باتیں سُنانے
گلے لگ کے ملنے
اسے اپنی آنکھوں میں
دل میں سمانے
سلاسل سے آزاد
میں
موسموں کے، ہواؤں کے ہمراہ
بہتا چلا جا رہا تھا
سفر دُور کا تھا، بہت دُور کا تھا
خلاؤں کے اس پار
اُڑتا چلا جا رہا تھا

۱۹۸۵ء

میں سرشار چہروں کے
جھرمٹ سے
گزرا تھا اک روز
شاداب، روشن، حسیں جسم، خوشبو کے دھارے
مرے چار سو موجزن تھے
جواں سال، رنگوں کے ریلے
اترتے گئے
میری گہرائیوں
میری پہنائیوں میں

یہ سب
جشنِ سیلِ فروزاں میں مجھ کو
معطر، منور پروں پر

آج پھر بَین کرتی صداؤں سے آباد ہے
روزنوں میں
کشادہ مگر اک زمانے سے اُجڑے
تہی روزنوں میں
ہزاروں، جواں سال سر بھی ہیں، سینے بھی بازو بھی
منظر سے مغلوب
جسموں کا ہنگام
سر بستہ رہ گیر، رہ زن، تماشائی
قاتل بھی مقتول بھی
دور تک آسماں بوس
دل دوز چیخوں کا کہرام
لاکھوں لہو رنگ توسوں کی تحویل میں
چو رمینار دائم

______ ۱۹۸۵ء

چور مینار

اک زمانہ ہوا
چور مینار کے روزنوں میں
بریدہ سروں کی
نمائش نہیں ہو سکی

مرگِ انبوہ کا
واقعہ، سانحہ، حادثہ
کوئی ایسا نہ تھا
جس کو دستِ مصوّر سے
رنگِ فضیلت کا اعزاز ملتا

ہوا، شور کرتی ہوا
صرفِ ماتم نہ تھی
حرفِ گریہ نہ تھی
ایک معمول تھی، صرف معمول تھی

یہ فراموش، گمنام، بیکار خفتہ کھنڈر

کوئی راوی
داستاں گو
سامری
کوئی تماشائی
نہیں کوئی نہ تھا
کچھ بھی اب باقی نہ تھا

راکھ کی بارش
مکانوں، رہ گزاروں، بستیوں پر
بے صدا رفتار سے ہوتی رہی
رات بھر جاری رہی

۱۹۸۵ء

راکھ کی بارش

آنے والی شب سے قبل
چند خوش بختوں کے نام
نامۂ رنگیں ملا
روزنِ افلاک ان پہ کھل گیا
اور دامن
بے نہایت موتیوں سے بھر گیا

کوچہ و بازار میں
سیلِ ہجومِ بے مراد
ہر دعا سے
اور امکانِ جزا سے
ماورا ہوتا گیا
رفتہ رفتہ
لوگ
گوش و لب سے عاری ہو گئے

اب مگر پھیلتے ہوئے کوہ سار
آتش فشاں صداؤں کے
شور کرتے الاؤ
برسوں میں بن گئے ہیں

یہ بے ضرورت
وہ دشمنِ جاں ہیں
جن کی میں پرورش پہ مجبور رہوں
دمِ مرگ نور تھا
ٹوٹتے ستاروں کے خواب
راتوں کو دیکھتا ہوں

یہیں کہیں ایک دستِ نشتر
مرا مسیحا، مری بقا ہے
خدا مجھے صبر دے، مجھے اعتماد دے
میں اسے
رگ و پے کی تیرگی میں آتارتا ہوں
میں زیرِ آبِ کثیف ہوں
اپنی ڈوبتی روشنی کے گمنام
موتیوں کی متاعِ نایاب تیرگی سے اُبھارتا ہوں

۱۹۸۵ء

جو جاگتا ہے
وہ ایک پتھر
جو شور کرتا ہے
دوسرا ہے
زمین
چٹیل، خموش چٹیل زمین پر
میرے خون کے
اضطراب نے
ان کو کیوں ابھارا تھا؟ کیوں ابھارا

یہ فتنہ ساماں
نہ برگ و گل تھے
نہ وہ ثمر تھے
جو لذتوں کے امین بنتے

یہ میرے خلیوں
یہ میرے ریشوں کی
بے وفائی کے
بے ضرر سے خفیف نقطے تھے

نورِ دل و جاں نذر کرتے ہیں
ہمارے درمیاں
کوئی سگِ بیمار ہے

آواز
رہ رہ کر
فضا میں گونجتی ہے
وہ لڑکی قریۂ بے نام میں موجِ صبا تھی
وہ لڑکی نیند سے نا آشنا تھی
وہ لڑکی نام ہے اس کا بھلا سا
وہ لڑکی روتے روتے سو گئی ہے

_____ ۱۹۸۵ء

بے نام

یہ موسم بھی، عجب موسم ہے
وقفہ
صبح کا ہے
شام کا
یا رات کا
یا زہر آلودہ
بھیانک خواب کا ہے

ریزہ ریزہ
گر رہی ہے خامشی
ویراں مکانوں پر

سوادِ قریۂ بے نام میں
ہنگامِ جشنِ روزِ آخر کے لیے
ہم لوگ کب سے منتظر تھے
خیر مقدم کے لیے

ساحلی قصبے کے
چوراہے پہ وہ طرّار اور سرشار
خنجر بیچتا ہے
تالیوں، قہقہوں کی شام کو
سارے سگانِ شہر
اس کو
سجدۂ تعظیم کرتے ہیں
اسے چشم و دل و جاں سے
بہم تسلیم کرتے ہیں
لہو کی سلطنت
پھیلی ہوئی ہے
اب سوادِ شہر سے آفاق تک شاید
وہ کابوسی
امیرِ شہر بن کر جی رہا ہے
سلطنت میں
خون ارزاں ہے
وہ روز و شب مسلسل پی رہا ہے

———— ۱۹۸۴ء

لہو کی سلطنت

سفر سے قبل
اس کی آنکھ میں
پرکار جنگل تیرتے تھے
وہ شکاری، منحنی سا جانور
آواگون کے سلسلوں میں
رنگ و نسل و قوم کی
طغیانیوں میں
اِک بلبلے کی طرح
پرّاں رہا تھا
دستِ نشتر سے
وہ بندر کی سعادت سے گزر کر
دیدۂ جاسوس بن کر جی رہا ہے

میں اسے کل پھر ملا تھا

ننھا منا اجنبی
خوبصورت اور طلسماتی
سُنا اور آن سُنا سا
اک نرالا اور انوکھا
نام دے کر چل دیا
مَیں شفق کی
آخری سرگوشیوں میں
دیر تک
کھویا رہا

۱۹۸۴ء

ہوا تھا چشمِ رحمت سے جُدا
واقعہ کو، واقعہ کی
فطرتی مضراب سے
زندہ و مسرور گرچہ مَیں نے اکثر کرلیا
داستاں کے اوج پر
ہر سعادت سے مگر محروم تھا
طفلِ ناداں تھا
وہ ننھا نوجواں

اتفاقاً رہ گزر پر
آج جو مجھ کو ملا
وہ تعارف کے تکلف سے

سراسر ماورا تھا
چند ہی لمحوں میں اُس نے
آسمانوں اور زمینوں کے فسانے
تانے بانے

سب سُنا ڈالے
عجب جادو تھا
اس کے غیر آلودہ نطق و لب میں
بے خود و مبہوت
اس کی گفتگو
میں دیر تک سُنتا رہا
داستاں کے نقطۂ امکاں پہ وہ

کامراں تھا
ایک روشن قہقہہ تھا
شام کے سائے
اترتے آرہے تھے دور تک
وقتِ رخصت مجھ کو وہ

میرا نیا نام

تم نے پوچھا مجھ سے میرا نام
اور خاموش
کچھ ایسے ہوئے
مجھ کو اکثر یہ گماں گزرا
کہ میں بادل کے سائے میں

پنجرے ہوئے کچھ مرد
دبلے زرد بچے
ادھ مری
سوکھی ہوئی کچھ کھیتیاں تھیں
وادیوں میں
ڈوبتا دن، ڈوبتا مرتا ہوا دن
فاصلوں کا بے صدا کہرام!!

میں تماشائی تھا یا پھر خود تماشا تھا
مجھے اک دوسرے کہسار سے
موج نشیب کوہ سے
شاید کہیں کوئی تماشائی
نگاہِ دوربیں سے دیکھتا ہوگا
یہاں میں دیو قامت دیو داروں کے قبیلے کا
کوئی بچھڑا ہوا نغمہ تھا
روتی عورتوں کی، زرد بچوں کی فغاں تھا
یا کماں کا تیر
یا میں صرف نقطہ تھا
شبِ اسرار کا منظر
قریب و دور کا
اطراف کا منظر
نشیبِ کوہ کا منظر
سرِ کہسار کا منظر

______ ۱۹۸۴ء

دُور کا منظر

سرِ کہسار کا منظر
کتابِ رہ نما ہیں
دیو قامت دیو داروں
برف زاروں
سیمگوں جسموں
دمکتے سُرخ چہروں
لالہ و گل کے
درخشاں سلسلوں کا
پُرکشش رنگیں فسانہ تھا

سرِ کہسار منظر بین
میں تحیر کی گہرائیوں میں ایستادہ تھا
مکاں تھے
دور تک بکھرے ہوئے
کچھ منحنی سے
آگ روتی عورتیں

لاشوں کے انبار کے اوپر بیٹھا ہے
بچہ جیسے پہروں رو کر سویا ہے
ننھی منی گڑیا
بھیڑیں — اپنی ماں سے بچھڑ گئی
بندر ادرک کھاتا ہے
باگھ ہے موٹا لال ٹماٹر
بھالو لیموں پانی پیتا ہے
دور دور تک تصویروں کا میلہ ہے

میری اور تیری تصویر کہاں اس میلے میں
ہم میلے کی سرحد پر
پتھر کی مورت کی صورت
سناٹوں اور چیخوں کے کہرام میں
گم سم، گم سم بیٹھے ہیں

دور دور تک تصویروں کا میلہ ہے

۱۹۸۴ء

تصویروں کا میلہ

تصویروں کے میلے میں
ساری تصویروں کے
بکھرے چہرے، دست و بازو
باتیں کرتے ہیں

ایک پرندہ چوپایہ ہے
دوسرا چوپایہ طائر
قاتل نے پہنا ہے صاف سپید لباس
اور مقتول
زیر خاک
اپنا ماتم کرتا ہے
لڑکی شاید
پربت پربت آبشار سے
خون کے دریا میں
کل شب اتری تھی

لڑکا
نیلے امبر میں

تحریر

مَیں نے فرازِ جسم پہ
محراب لکھ دیا
جب رات ڈھل گئی
مَیں نے فصیلِ شہر پہ
مہتاب لکھ دیا

مَیں رات بھر
برہنہ جسم پہ لکھا گیا
مَیں نے سنہرے جسم میں
بوئی تھی داستاں
مَیں نے سیاہ رات کو
سونپا تھا ماہتاب
وہ رات
میرے دل پہ اضطراب لکھ گئی
وہ رات
دور تک
سنہری دھوپ، سُرخ پھول
سیلِ آفتاب لکھ گئی

۱۹۸۴ء

آج پھر کئی روز
خاک و خوں سے
میں قریہ و شہر لکھ رہا ہوں
شبِ مضافات لکھ رہا ہوں
عجیب برپا درات ہے
صرف ایک روشن حسین ستارے کی آرزو میں
لہولہو با نجھ ہو چکی ہے
سیاہ کاروں کا،
ایک ریوڑ ہے دور تک
ایک بنتِ معصوم
رہ گزاروں پہ
اپنی بادل، سپید نوریں، سپید بادل سی ماں
کو ہر وقت تلاش کرتی تھی
موج موہوم تھی
وہ شاید
جلے ہوئے شہر کی پناہوں میں
کھو گئی ہے

۱۹۸۴ء

ہمارے قصبے میں
قید و بندِ حیات سے
دور جانے والوں کا
ہر تناسب ہے منصفانہ
وہ فرقہ و قوم
جنس و درجہ و حیثیت
ظلم اور تشدد کے جانے پہچانے
سب تقاضوں پہ پورے اترے
جو مردِ جبرِ حیات سے ماورا گیا
اس کی ہم سفر
اس کے نقشِ پا کی
دریدہ عصمت کی آندھیوں میں
بکھر گئی تھی
چراغِ خانہ بس ایک انبوہِ استخواں تھا
ہوا تھا تقسیم
صاحبانِ ضیا میں ہفتے کی شام کو

دور دور تک پیاسے جلتے بجھتے لوگ
بادل، بارش
سبزہ
پتّے پودے، پیڑ
بھولے بسرے خواب

دور دور تک شعلوں کے طوفان کا موسم آیا
سب کے سر پر
آنے والے موسم کے اعلان کا گھٹتا بڑھتا سایہ
یہ کیسا موسم آیا — !!

—— ۱۹۸۴ء

آسمان میں آگ

پیڑوں کے پتّے
جلتی دوپہروں کو
آنے جانے، والوں کو
سایہ دیتے ہیں
اپنے ہونے کا اعلان نہیں کرتے
سائے کا اعلان نہیں کرتے

مَیں گھر سے بچھڑا تھا جب
تو اکثر
برسوں
جلتی دھوپ میں
ان کی شفقت کے سائے میں سویا تھا

کچھ دن سے
دور دور تک آسمان میں آگ

ایک جال
بادبانِ قالب
روز و شب
عکسِ زوالِ عمر سے سہیم گریزاں
سیلِ موجِ لذتِ تسخیر
اخباری کماں کا تیر
ہنگامِ فسادِ آرزو کے شہر میں
سرشار
وارفتہ
خراماں
چاک داماں
سب تماشائی
وہ بختی
گل بداماں ——!!

——— ۱۹۸۴ء

پورٹریٹ

خضابی زلف
آنکھوں پر
سیہ چشمہ
تبسّم کے، تکلّم کے
ادا و عشوہ و غمزہ
تراوش کا
نمائش کا
بساطی سلسلہ
ملبوس
تازہ تر
حسیں، پرکار
شاہِ مشتہر کی
خاکِ پا سے
اس کی پیشانی منوّر
میہماں بھی، میزباں بھی

وہ ملاقاتِ منوّر
کیا عجب یہ حادثہ تھا
وقتِ رخصت تم نظر آئیں مکمل
مَیں ہزاروں آئینوں میں گھر گیا تھا
رہ گزر پر
روشنی میں
دور تک بکھرا ہوا تھا

—— ۱۹۸۴ء

پروں کو کھولتی پرنم فضاؤں میں
کبھی تم صرف چہرہ تھیں
فقط انوارِ چشم و لب
سلگتی ، بولتی تنہائیوں میں
دُور کا وحشی سمندر کا کوئی نغمہ
کوئی جلتا ہوا شہر فراواں
یا کوئی روشن شگفتہ پیرہن
زیر زمیں
آواز دیتا ،
مرگ آسا اجنبی
سرگوشیاں کرتا جہنم
جسم صرف اک جسم
سرتاپا
ترنم
تیرگی میں تیز بارش
ساعتِ کاذب میں رفتہ رفتہ گرتی نرم شبنم

سب تمھارے عکس تھے
تم سا مگر کوئی نہیں تھا

مَیں اسیرِ زلف تھا
یا صیدِ خوشبو
یا تمھارا نقشِ پا تھا
فیصلہ کرنے میں مجھ کو
عمر گزری
سب ملاقاتیں ادھوری تھیں
وہ شاید آخری تھی

آخری مُلاقات

ملاقاتوں کا کیا سلسلہ تھا
آتے جاتے موسموں میں
روز و شب کی سرحدوں میں
چاندنی میں
تیز جلتی دھوپ میں
محفل میں
سیلِ ہاؤ ہُو میں
بند کمروں میں

تم تو میرے اپنے تھے
تم نے یہ کیا کر ڈالا
تم نے اپنے ہاتھ سے
میری برسوں کی مانوس لکیریں
درہم برہم کر ڈالیں
آوازوں کی، راگنیوں کی، تصویروں کی
روشن آنکھیں
پرنم کر ڈالیں

تم تو میرے اپنے تھے

۱۹۸۴ء

تَشدُّد

اس کمرے کی ترتیب سے
مَیں مانوس تھا
اس کی ہر شے سے
چھت سے ، دلواروں سے
چھوٹی چھوٹی چیزوں اور کتابوں سے
مترنّم آوازوں سے
شور مچاتے ، ہنستے گاتے
گاہے گاہے لمحہ بھر کو
چپ ہو جاتے
اپنے اپنے آسمان سے
تنہائی میں
سکھ اور دکھ کی باتیں کرتے لوگوں سے
ننھی مُنّی سرگوشی میں جادو بھرتی
گڑیا سے
رنگ لٹاتے، اس کے نٹ کھٹ گڈے سے

میں سنگِ بخت پر
فرطِ مسرت میں سنہرا جام لکھتا ہوں

فرازِ صبح کا ہنگام
افسردہ و واماندہ
یہ چھوٹا، ننھا منا گھر
درِ خستہ پہ دستک پیٹتی ہے سر
خدا جانے کہاں سے کون آیا ہے
ہمارے چشم و لب تشنہ
دلوں میں دور تک پھیلی ہوئی بے نام ویرانی
یہ سارے خشک پتے رہ گزاروں پر کہاں سے کون لایا ہے

_____ ۱۹۸۴ء

اَاٹری

یہ چھوٹا، ننھا مُنا گھر
شبوں کو
اک طلسماتی حسیں ایوان بن جاتا ہے
اس کے سب دریچے
کوہ ساروں، آبشاروں
کی طرف کھلتے ہیں
تم روشن پری
آکاش سے دھرتی پہ آئی ہو
فرشتے سجدۂ تعظیم میں ہیں
آج کے سب موسموں کو
آنے والے موسموں کی لذتوں کو
رو بہ رو سب کے
تمہارے نام لکھتا ہوں

ساحل

خوشبوؤں ، بدبوؤں کے
متضاد ، مخالف
سیلابوں سے بچ کر آئے لوگ
اک ایسے ساحل پر
اب اترے ہیں
جو لمحہ لمحہ کٹتا جاتا ہے
مبہم ، پُرنم ، رفتار سے پیچھے پیچھے ہٹتا جاتا ہے

اک پیڑ کے نیچے جوت جگائے
دُور دیس سے آنے والوں کی تم آس لگائے
صدیوں سے چپ چاپ بیٹھی ہو
ننھے کی پیاری نیند سہانے سپنے
بیداری اور خواب کی سیماؤں میں ایسے الجھے ہیں
وہ روتے روتے
تھوڑی دیر ہوئی تھی پل بھر سویا تھا

تم ساحل تھیں
تم پر بھی آخر کیا گزری
تم آنے والوں کے زخموں کے گیت
اندھیری راتوں میں
اکثر رو رو کر گاتی ہو
سیلاب میں بہتی جاتی ہو

۱۹۸۴ء

یہاں سیلِ فتنہ گر میں
میں ٹوٹتے دن کو نام لے کر پکارتا ہوں
مَیں آخری چاند اور سورج تلاش کرتا ہوں

رو برو ، میرے رو برو
آج کیسا منظر ہے ، کیسا منظر ہے
صورتِ گل —— یہ کون ہے ، میری کون ہے
کیوں یہ میری جانب جوارِ دہشت میں
سہمی سہمی اداس نظروں سے دیکھتی ہے
وہ روئے حسرت گداز شاید سیاہیوں میں اُتر گیا ہے
پیام جس کے لیے وہ رو رو کے بھیجتی ہے !!

—— ۱۹۸۴ء

آخری چاند اور سورج

وہ شخص کابوس کی طرح
سیلِ رہ گذر میں رواں دواں ہے
دعائے محروم
بوالہوس
تیرہ کار
ممنوع لذتوں کا اسیر
مصروفِ کاروبارِ زیاں
وہ ننھے حسین بچوں کو
استخوانی رکابیوں میں
فروخت کرتا ہے
زرد چہروں کو، سرد جسموں کو
جیب و داماں کی تیرگی میں اتارتا ہے

یہ خاک بدروح ہے

موسموں کی راکھ

یہ مکاں ہے
یا کوئی مرقد
عبادت گاہ
مقتل
یا کھلونا گھر
مکیں کوئی نہیں ہے
سنسنائی خامشی میں
چاپ سی کوئی
سنائی دے رہی ہے

مَیں تماشائی ہوں
زیرِ آسماں،
چپ چاپ
منظر کی پناہیں ڈھونڈتا ہوں
اک ہیولا سا
افق کی سرحدوں پر
تیرتا ہے
موسموں کی راکھ
اڑتی جا رہی ہے
رات
کالی رات سر پر آ رہی ہے

۱۹۸۴ء

درد کے اس گوشۂ محفوظ سے
تنہائیوں میں ٹوٹ کر ملنے
اسی روشن جزیرے پر
گزرتے موسموں کے ہم سفر
ہم لوگ
شاید اگلے برسوں میں
بشرطِ زندگی
آیا کریں گے
خزاں کا گیت باقی ہے
خزاں کا گیت ہم دونوں
اُبھرتی ڈوبتی سی
بے نوا آواز میں گایا کریں گے

۱۹۸۴ء

امروز ہم
اترے ہیں
اک ایسے جزیرے پر
بہ فیضِ لمسِ قربِ نو
جہاں میرے تمھارے، زیرِلب
سرگوشیاں کرتے ہوئے
جنگل منوّر ہو گئے ہیں
چارسو
رنگِ شفق سے
دور اور نزدیک کے
گلنار
منظر ہو گئے ہیں

جانے کیوں محفوظ ہے لیکن کہیں اب بھی
ہمارے درد کا
نایافت،
انجانا کوئی گوشہ
کوئی جاگا ہوا
سویا ہوا محشر
کوئی منظر، کوئی منظر

ہجومِ نارسا میں
گرتے پتّوں
آبشاروں
دور تک پھیلے سمندر
کوہ ساروں
جذبِ دل کی وادیوں میں

خزاں کا گیت

زوالِ عمر میں
تم اور میں
اکثر اتر جاتے ہیں
اپنی اپنی تنہائی کے غاروں میں
جہاں پر
جانے پہچانے ہمارے جسم و جاں
اوران کے جنگل ہیں
مگر ان کے کچھ ایسے
اجنبی گوشے نہاں ہیں
جن سے ہم لمبے سفر کے زیروبم میں بھی
شناسا ہو نہیں پائے

فروغِ شام میں

صرف میں ہوں یہ میں، اور
مرے خوں میں
زہر ہلاہل کی مانند
ہر آن
تحلیل ہوتا ہے رنگِ مکافات
چاروں طرف قہقہے گونجتے ہیں
مرے چارسو
ایک جشنِ عداوت کا ہنگام ہے
قہقہہ ہوں، یا گریہ
یا بہتی ہوا
راہ رو، راہ زن
زہر پیتا ہوا، آبِ نوریں ہوں میں
قتل کرتا ہوں میں
میں ہی مقتول ہوں
موجِ سفاک ہوں
میں ہی تریاق ہوں

۱۹۸۴ء

پاؤں سے سر تلک میں مکمل ہوں
سب صورتیں
ساختی زاویے
بولتے ، بات کرتے ہوئے
سوختہ جاں ہوں
وہ آتشِ بے کراں
سب مسیحا ہیں جس کے لیے
سنگِ حرفِ دعا
ان کی آنکھوں میں
لیکن بس
خدا جانے کیوں
کوئی وحشی ستارہ نہیں

نارسائی

دریچے بند ہیں
اور شہر
سربستہ، پریشاں

روشنی سے
ہو گیا محروم شاید

خامشی

صرف ایک روزن
داستانی
ایک روزن

وا ہے
اس کے حلقۂ انوار میں ہے
معجزہ سی
ایک انگشتِ حنائی
رہ گزر پہ
دور تک پھیلا ہوا
بے نام، متلاطم، ہجومِ نارسائی

۱۹۸۷ء

یہیں کہیں پہ ایک سنگِ بے نشاں ہے
پتھروں کے، کنکروں کے ڈھیر میں
برس گزر گئے
نہ جانے کیسے آج یاد آگیا
لکھا تھا اس پہ ہم نے اپنے ہاتھ سے
تمھارا نام میرا نام
مَیں بھی سوچکا ہوں
تم بھی ہونٹ کھولتی نہیں
سگانِ شہر
زہر گھولتی ہوئی زبانِ شہر

ـــــــــ ۱۹۸۳ء

بے نشاں

فصیلِ شہر،
اب کسی کو روکتی نہیں
فصیلِ شہر،
صرف پتّھروں کا، کنکروں کا ڈھیر ہے

ہزار، دس ہزار
ایک لاکھ
بے اماں، نزار لوگ
شہر میں اتر رہے ہیں
ہر برس
ہر ایک رہ گزر
کدورتوں کی، بے مراد شہوتوں کی رزم گاہ
سیلِ ہاؤ ہُو میں
اب فصیلِ شہر بولتی نہیں
کسی کو بازوؤں میں تولتی نہیں

یہ شخص کون ہے
کیوں یہ اپنے گھر کا رستہ بھول گیا
سر پر لمبی کالی رات کھڑی ہے
اب یہ کون سے در پر دستک دے گا
کون سے گھر میں جائے گا
مٹھی بھر خیرات کی نیند
کہاں سے پائے گا

۱۹۸۳ء

نیلے لہراتے پردوں والا گھر

اک شخص پوچھتا پھرتا تھا
کل شب
اپنے ہی کوچے میں
نیلے لہراتے
پردوں والے
ہرے بھرے آنگن میں کھلتے
گھر کا پتہ
وہ ایک طرف سے چلتا ہوا
جب دوسری جانب پہنچا تھا
تھوڑا تھوڑا سا گم سم تھا
وہ ایک سرے کو چھو کر
واپس چلنے لگتا تھا
اک سرگوشی سی
اس کے پیچھے پیچھے چلتی جاتی تھی

پودے پھیلتے جاتے ہیں
میرے جسم پہ پاؤں جماتے
میرے سر کی جانب بڑھتے آتے ہیں

اک موسم تو بیت گیا
دوسرا موسم آیا
دھوپ کا رنگ عجیب سا ہے
یہ کون سا موسم آیا ـــــ !؟

ـــــ ۱۹۸۳ء

دُوسرا موسم

بارش کے موسم میں
میرے آنگن میں
کچھ خود رو پودے
اُگنے لگتے ہیں
شاید اوروں کے ہاں بھی
یہ سب کچھ ہوتا ہوگا
لوگ سُنا ہے ان کو کھینچ نکال کے پھینک دیا کرتے ہیں
میں بھی ایسا ہی کرتا آیا ہوں شاید برسوں

اب کے برس
بارش کے بعد بھی میں تصویر بنا بیٹھا ہوں

اَجنَبی

اجنبی شہر سے وہ گزرا تھا
شام تھی اور اُداس موسم تھا
باہیں پھیلائے شب کھڑی تھی اور
ایک مہماں کا خیر مقدم تھا
دُور تک گونجتا تھا سناٹا
تیرگی تھی چراغ مدھم تھا
صبح آئی تو شعلہ سی
درد بھی روشنی کا پیہم تھا
تیز تھی دھوپ خاک اُڑتی تھی
چارسُو ایک ہُو کا عالم تھا
نام اس کو وہ کیوں نہ دے پایا
دل میں اس کے عجیب سا غم تھا
کس سے کہتا وہ داستانِ دل
دوست تھا اور اس سے برہم تھا

۱۹۷۹ء

شہر میں ایک تحریر

میں نے پتھر سے لکھا
اس نے شیشے پر پڑھا
درسِ عبرت خوب تھا
چند لمحوں کے لیے
طفلِ مکتب کی طرح
وہ پریشاں ہو گیا
اور پھر اس شخص نے
ٹھیک اسی انداز سے
جو مرا انداز تھا
ہاتھ میں پتھر لیا
اور سارے شہر میں
درسِ عبرت لکھ دیا

کچھ اور نظمیں

ترتیب

——— گارگی کومل کے نام

شہر میں ایک تحریر

بلراج کومل

موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

مُصنّف کی دیگر تصانیف

میری نظمیں ۱۹۵۴ء
رشتۂ دل ۱۹۶۳ء
ناریل کے پیڑ (ہندی) ۱۹۶۷ء
ہریالی کا ایک ٹکڑا (ہندی) ۱۹۶۸ء
سفر مدام سفر ۱۹۶۹ء
انتخاب (انجمن ترقی اُردو) ۱۹۷۱ء
نژادِ سنگ ۱۹۷۵ء
آنکھیں اور پاؤں (افسانے) ۱۹۸۱ء
پرندوں بھرا آسمان ۱۹۸۴ء
ادب کی تلاش (تنقید) ۱۹۸۵ء

شہر میں ایک تحریر

بلراج کومل

بَلراجؔ کومَلؔ

شاعر، افسانہ نگار، نقاد

جَنَم : ۲۵ستمبر ۱۹۲۸ء، سیالکوٹ (پاکستان)

تَعلیم : ایم۔اے (پنجاب یونیورسٹی)

اعزاز : اترپردیش اردو اکادمی
میرا اکادمی، لکھنؤ
وزارتِ تعلیمات، حکومت ہند

دہلی اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۲ء
ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۵ء